عبدالمجید سالکؒ

یارِ زنداں

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے۔ میں دفتر "زمیندار" میں بیٹھا ہوا تھا کہ مولانا حامد حسین بیدل شاہجہان پوری آ گئے۔ اور کہنے لگے۔ اب تو شام ہو گئی۔ گھر نہیں چلتے؟ میں نے کہا۔ آپ دس منٹ بیٹھئے۔ میں ابھی فارغ ہوا۔ چنانچہ دس منٹ کے بعد میں بیدل صاحب کے ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچا تو مردانہ میں بیدل صاحب کو بٹھا کر خود اوپر گیا اور چائے کے لئے کہہ آیا۔ ابھی چائے تیار نہ ہوئی تھی کہ نیچے سے منشی نذیر احمد سیماب (پبلشر زمیندار) نے مجھے پکارا۔ اور کہا ذرا سیڑھیوں میں آ کر میری بات سنیئے۔ میں نیچے اترا تو سیماب صاحب نے بتایا کہ مرزا غلام حسین انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر میرے مکان پر آئے انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ اور آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔

چونکہ میں ہر روز اس دن کا متوقع تھا۔ اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ میں نے اوپر جا کر اچکن پہنی۔ گھر والوں کو اپنی گرفتاری کی خبر سنائی اور انہیں ہائے وائے کرتا ہوا چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ مرزا غلام حسین نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ مجھے تانگے میں بٹھایا اور تھانہ نولکھا کو چل دیئے۔ انسپکٹر صاحب نے ہمارے لئے چائے اور پیسٹری منگائی ہم کھانے پینے اور قہقہے لگانے میں مصروف ہو گئے۔ کوئی دو گھنٹے بعد مرزا صاحب نے فرمایا کہ اب آپ آرام فرمائیے۔ میں حوالات کی کوٹھڑی میں جو تھانے کی ڈیوڑھی میں ہے بند کر دیا گیا۔

صبح نو بجے مرزا غلام حسین انسپکٹر تشریف لائے۔ مجھے حوالات سے نکالا۔ نہایت "شفیقانہ تبسم" کے ساتھ مجھے ہتھکڑی لگائی اور تانگے میں سوار کرا کر عدالت میں لے گئے۔ وہاں دوست احباب جمع تھے۔ میں لالہ شنکر داس لوتھرا مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ جنہوں نے ایک منٹ میں سماعت مقدمہ کی آئندہ تاریخ مقرر کر دی۔ اور میں قیدیوں کی گاڑی میں سنٹرل جیل کو روانہ ہوا۔

وہاں پہنچا تو جیل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی ایک بزرگ نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ آپ مرزا نواب بیگ جیلر ہیں۔ آپ نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ ان کو حوالات میں لے جاؤ۔ حوالات میں پہنچا تو مجھے ایک کوٹھڑی میں داخل کر کے اس کا سلاخ دار دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ منشی نذیر احمد سیماب شروع ہی سے میرے ساتھ تھے۔ وہ بھی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیئے گئے۔

کچی مٹی کی کھڈی، کچا فرش، دیواروں پر مٹی کا پلستر، غرض جدھر نظر اٹھتی تھی خاکساری کا جلوہ نظر آتا تھا۔ دن بھر میں دو دفعہ قیدی کھولے جاتے تھے۔ یعنی ان کی کوٹھڑیوں کے قفل کھول کر انہیں اجازت دی جاتی تھی کہ احاطے میں گھوم پھر کر ہوا خوری کر لیں۔ اس وقت آپس میں ملاقات اور بات چیت ہوتی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کے حالات و خیالات معلوم کر لیتے تھے۔

مقدمے کی سماعت ہوئی۔ استغاثہ پیش ہوا۔ استغاثہ کے گواہ پیش ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ ملزم نے

"زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ایسا مضمون لکھا۔ جس سے ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں (ہندوستانیوں اور انگریزوں) کے درمیان نفرت و حقارت پیدا ہوتی ہے (دفعہ ۱۵۳۔ الف تعزیرات ہند) مجھ سے پوچھا گیا۔ جرح کرو گے؟ عرض کیا نہیں۔ پوچھا گیا صفائی پیش کرو گے؟ جواب دیا نہیں۔ صرف ایک تحریری بیان داخل کروں گا۔ جس کے لکھنے کے لئے جیل میں تحریر کی سہولتوں کا طالب ہوں۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ سالک صاحب کو جیل میں قلم دوات کاغذ مہیا کر دیا جائے۔

جیل والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کو زیادہ تر یکجا کر دیا جائے۔ اس کے بعد ان کے چالان مختلف جیلوں میں بھیج دیئے جائیں۔ چنانچہ ایک دن یورپین وارڈ سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خاں، راجا غلام قادر خان، سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما (بھوانی) اور ایک اور ہریانے کے ہندو جاٹ صاحب (جنکا نام بھولتا ہوں) ہمارے احاطے میں جمع ہو گئے اور خاصی چہل پہل ہو گئی۔

انہی دنوں میں نے اپنا تحریری بیان لکھ کر عدالت میں داخل کر دیا۔ لالہ شنکر داس لوتھرا نے مجھے ایک سال قید بامشقت کی سزا کا مژدہ سنایا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد موٹر کار میں بیٹھا اور سنٹرل جیل پہنچ گیا۔ اب حوالاتی نہ تھا بلکہ قیدی بن چکا تھا۔

اخلاقی قیدیوں کے حوالات سے چلے جانے کے بعد چونکہ سب کے سب سیاسی قیدی ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے میرے انسانی مطالعہ کا دائرہ محدود ہو گیا تھا۔ اب بابا گوردت سنگھ، لالہ لاجپت رائے، پنڈت سنتانم، ڈاکٹر گوپی چند بھاء گو، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ملک لال خان جیسے "سیاسی ڈاکو" پیش نظر تھے۔ ہم نے جیل کے حکام سے کہہ کر یہ انتظام کر لیا تھا کہ کوٹھڑیوں والی بارک میں تو خاص قسم کے سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ لیکن کھلی بارک میں ہم سب جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ کھلی بارک گویا ایک ہال تھی جس میں کوئی ایک سو قیدیوں کے رہنے کا بندوبست تھا۔ اور ان کے درمیان کوئی دیوار وغیرہ حائل نہ تھی۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ معلوم ہوا۔ حکومت ہم میں سے چند آدمیوں کو میانوالی جیل بھجوانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ چنانچہ ایک دن رات کے وقت گیارہ آدمیوں کا ایک قافلہ تیار کیا گیا۔ اور ان کے بستر، ٹرنک اور دوسرا سامان باندھ کر رکھ دیا گیا۔ اس قافلے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خاں، راجا غلام قادر خاں، میں اور نذیر احمد سیماب، سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور ایک ہریانے کے جاٹ ہندو لیڈر۔ یہ گیارہ نفوس تھے۔

جب جیل کے بیرونی دروازہ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا فوجی ٹرک کھڑا ہے اور پولیس کے بارہ تیرہ جوان ایک انگلو انڈین انسپکٹر کے زیر سرکردگی موجود ہیں۔ ہمارا سامان بھی ٹرک میں رکھ دیا گیا۔ اور ہم بھی اسی میں سوار ہو گئے۔ لیکن اس سے پیشتر بطور حفظ ماتقدم دو دو آدمیوں کے ایک ہتھکڑی لگا دی گئی مثلاً میں اور نذیر احمد سیماب ایک ہتھکڑی میں تھے۔ میرا بایاں ہاتھ ان کے دائیں ہاتھ کے ساتھ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا۔ اور میرا دایاں ہاتھ اور ان کا بایاں ہاتھ آزاد تھے۔ یہ ٹرک رات کے نو بجے جیل سے روانہ ہوا اور جیل

روڈ، لٹن روڈ، لوئر مال سے ہوتا ہوا دریائے راوی کے پاس سے گزر کر بادامی باغ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ہم ٹرین میں سوار کرائے گئے۔ اور اس کے بعد ہر جنکشن پر پولیس کا ایک دستہ پلیٹ فارم پر حاضر ہو کر ہمارا جائزہ لیتا رہا۔ رات گزری اور صبح ہوئی۔

تیسرے پہر میانوالی کے ویران اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ لیکن پذیرائی کے لئے کوئی پانچ چھ سو آدمی نعرے لگا رہے تھے۔ اور میانوالی کی پولیس نہایت اہتمام سے موجود تھی۔

جب میانوالی جیل کی عمارت سامنے نظر آئی تو دیکھا کہ اس کے باہر ایک چبوترے پر کوئی تیس بتیس نگ ہمارے سامان کے رکھے ہیں۔ اور جیل کا سپاہی پاس کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ جیل کا دروازہ کھلا۔ ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہاں ایک وسیع احاطے میں کوئی پندرہ سولہ کوٹھڑیاں تھیں۔ جن میں سے گیارہ ہمارے حوالہ کر دی گئیں۔

انہی دنوں ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ العلماء، عبدالعزیز انصاری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (بارہ بنکی) اور سید حبیب بھی اسی جیل میں مقیم ہیں۔ اور عام قیدیوں کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ طعام و لباس میں کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ یہ سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ذکر کیا۔ چند روز جیل اور حکومت کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور آخر یہ حضرات بھی سپیشل کلاس میں ہمارے ساتھ شامل کر دئے گئے۔

جیل میں ایک خاص احاطہ تھا۔ جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں صرف چار کوٹھڑیاں تھیں۔ اس کو منڈے خانہ (یعنی لڑکوں کا احاطہ) کہتے تھے۔ اور ایک حصے میں ایک بڑا اور کھلا کمرہ تھا۔ جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لئے گنجائش تھی۔ چونکہ یہ کمرہ قید محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس لئے "محض کمرہ" کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خاں، مولانا احمد سعید، مولانا داؤد غزنوی، عبدالعزیز انصاری، میں، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا لقاء اللہ، صوفی اقبال، راجہ غلام قادر خاں، مولانا عبداللہ چوڑی والے دہلوی اور نذیر احمد سیماب "محض کمرے" اور منڈے خانے میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیئے گئے۔ جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ گردھاری امرتسری، لالہ ترلوک چند دیش، بندھو گپتا۔ (تیج) اور متعدد اور مشہور کارکن آگئے تھے۔

چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا۔ اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلاویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے۔ نماز باجماعت ادا کی۔ اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری، مولانا احمد سعید سے ادب عربی، صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگائی

جائے اور فلاں فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے۔ اور یہ "چوری چھپے" کے کام بھی انہی کے سپرد تھے۔ چنانچہ میں نے ان کا لقب "امام السارقین" مقرر کیا تھا۔

سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے۔ اس لئے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانے میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی۔

خیر میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی "مشقت" بھی کرتے تھے۔ یعنی چرخے پر پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) دری بافی کے لئے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم و تعلم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا تھا۔ اس وقت مولانا عبداللہ چوڑھی والے للکار کے کہتے "ارے بھئی کھانا تیار ہے" اگرچہ ہمارا کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبداللہ کو دے رکھا تھا۔ اور انہوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے کہ "جیل کو دیکھ کر گھر یاد آگیا" سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور پھر قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی۔ جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے! غرض ہم لوگوں کے مشاغل صوم و صلوٰۃ۔ تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔ لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجئے۔ یہ "مولبی لوگ" ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے۔

یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے۔ مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے استاد بھی تھے۔ عبدالعزیز انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں ہمارے ہم سبق تھے۔ لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خاں سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے۔ لیکن جو خصوصیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی وہ اپنے رنگ میں مثال نہ رکھتی تھی۔ شاہ جی اس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اردو اور فارسی میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ خصوصی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شگفتگی طبع ان کا خلوص ان کی محبت پروری بے مثال تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے وقت دوسرے احباب خواب غفلت میں بڑے خراٹے لے رہے ہیں اور میں اور شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے۔ خدا جانے وہ کون سے موضوع تھے جن پر اس قدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ لیکن دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔

جیل کی زندگی میں لطیفوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دن شاہ جی نے قصہ سنایا کہ پٹنہ میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ جس میں

لاتنا بزو بالالقاب

کی تفسیر کے سلسلے میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کی چڑ مقرر نہ کرنی چاہیئے۔ یعنی کوئی ایسی بات نہ کہنی چاہیئے جس سے دوسرا شخص چڑ جائے۔ مجلس وعظ میں ایک مقامی تحصیلدار صاحب بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا کہ لوگ یونہی چڑ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو چڑانے کی کوشش کرے اور وہ نہ چڑے۔ تو کوئی بات ہی نہیں۔ مخاطب نے جواب دیا "نہیں حضرت چڑ کی بات سے آدمی چڑ ہی جاتا ہے۔ اس سے تغافل کرنا بڑا مشکل ہے۔ تحصیل دار صاحب قائل نہ ہوئے تو دوسرے شخص نے خاموشی اختیار کرلی۔

دو چار منٹ گزرے تھے کہ اس شخص نے تحصیل دار صاحب سے پوچھا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ جواب ملا نہیں۔ صاحب میرے ہاں شلجم کا اچار نہیں ہے۔ کوئی دو منٹ کے بعد اس نے پھر سوال کیا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب نے جواب دیا "میں عرض کر چکا ہوں کہ نہیں ہے" یہ "بہت خوب" کہہ کر پھر چپ ہوگئے۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر پوچھا "تحصیلدار صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار تو ہوگا" اب تحصیل دار صاحب برہم ہوگئے اور کہنے لگے "کیا آپ نے مجھے مسخرا مقرر کر رکھا ہے۔ تین دفعہ تو کہہ چکا ہوں کہ شلجم کا اچار نہیں ہے۔ لیکن آپ برابر وہی پوچھے جا رہے ہیں۔ اس شخص نے معافی مانگی اور خاموش ہوگیا۔ لیکن ابھی دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟

اب تحصیلدار صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ کہنے لگے "عجیب بد تمیز ہو تم۔ یہ کیا بکواس ہے شلجم کا اچار ہے؟ شلجم کا اچار ہے؟" ساری مجلس وعظ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے وعظ روک دیا۔ اور اس شخص نے فقط اتنا کہا کہ صاحب میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ شلجم کا اچار۔۔۔۔۔۔ تحصیل دار صاحب نے جوتا پکڑ لیا اب آگے آگے وہ شخص اور پیچھے پیچھے تحصیل دار صاحب بھاگتے ہوئے مجلس وعظ سے نکل کر بازار میں پہنچ گئے۔ وہ شخص بار بار پیچھے مڑ کر پوچھتا شلجم کا اچار شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے دوڑتے یہاں تک کہ "شلجم کا اچار" شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار کا ذکر چھیڑ کر ان کو چڑاتے اور وہ چڑ کر گالیاں بکتے۔

لطیفہ نہایت دلکش تھا۔ دن بھر یاروں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی۔ کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو چڑایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشت شہادت سے اشارہ کر کے پوچھا "شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟" شاہ جی نے کہا نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ بعد اختر علی خاں پہنچے۔ اور اسی طرح انگشت شہادت کی پور سے

اشارہ کر کے پوچھا۔ کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟ شاہ جی نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے "شاہ جی پن ہے؟" اب شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے ادھڑ چکے ہیں۔ کہ باری باری آ کر پن مانگتے ہو؟ اتنے میں ایک اور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے۔ شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی؟ شاہ جی نے انہیں بری طرح ڈانٹا اس کے بعد جو ہر طرف سے "شاہ جی پن ہے؟" کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی غصے میں آ گئے اور مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد درآمد سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔ اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دہرا رہے تھے۔

ایک دن صوفی اقبال احمد پانی پتی (جو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے) مجھ سے کہنے لگے "سالک صاحب یہ اختر علی خاں بڑا ڈھنجرس آدمی ہے" میں نے پوچھا "ابے ڈھنجرس کیا ہوتا ہے"؟ نہایت معصومانہ انداز سے پوچھنے لگے "بھلا خطرناک" کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟ میں تو مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ اور یہ لطیفہ بھی احباب میں عام ہو گیا۔ اب ہم سب ڈینجرس کی جگہ "ڈھنجرس" ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

جیل میں ہم لوگوں میں سے اولیں رہا ہونے والے مولانا احمد سعید دہلوی تھے۔ میرا بھی قید کا سال ختم ہو رہا تھا۔ آخر رہائی کا دن آن پہنچا۔ میں ان دوستوں سے بچشم نم رخصت ہوا۔ اگرچہ رہائی کی خوشی تھی لیکن دوستوں کے جس جمگھٹے کو چھوڑ کر جا رہا تھا اس کے دوبارہ ملنے کی مدت العمر توقع نہ تھی۔ کیونکہ ایسا اتفاق کہاں ہوتا ہے کہ چند ہم مذاق اور مخلص احباب جمع ہوں۔ اور سال بھر یکجا رہیں۔ اور پھر یکجائی کا بھی یہ عالم کہ چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور ہیں۔ ہنستے ہیں کھیلتے ہیں۔ پڑھتے ہیں لکھتے ہیں۔ لڑتے بھڑتے بھی ہیں۔ لیکن چند لمحوں میں من بھی جاتے ہیں۔ جیل کی یکجائی میرے نزدیک ہم جماعت طلبہ کی یکجائی سے بھی زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ ہم جماعت ایک دوسرے کو بھول جائیں تو بھول جائیں۔ یاران زنداں ایک دوسرے کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

برجستگی

امیر شریعت رحمہ اللہ ۱۹۵۲ء میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں کراچی تشریف لے گئے۔ ریڈیو پاکستان کے مقابل مجلس احرار اسلام کے دفتر میں قیام تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری (مرحومین) دفتر چلے آئے۔ شاہ جی اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ سالک نے چھوٹتے ہی پھبتی کسی:

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر

(زبان پر اللہ کی پاکی کا بیان اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان!)

شاہ جی نے تسبیح مکمل فرمائی اور برجستہ فرمایا "میں تم دونوں کا ہی تصور کر رہا تھا"۔